Initial Engravings of Western Thoughts on Urdu Novel

اردو ناول پر مغربی افکار کے ابتدائی نقوش

Babar Rehman Shah*[1]
Ph.D. Scholar, Department of Urdu Language & Literature,
University of Sargodha.

بابر رحمان شاہ☆[1]

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اردو زبان و ادب، یونیورسٹی آف سرگودھا

Correspondance: babarrehman56@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 23-04-2025
Accepted:20-06-2025
Online:30-06-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: The tale of Urdu novel begins in the decade after the War of Independence of 1857, as the first Urdu novel Miral ul Uroos by Deputy Nazeer Ahmad(1831-1912) was published in 1869. Novel is evidently and strictly a Western originated genre, specifically, with the publication of the Spanish Novel Don Quixote by Miguel de Cervantes(1547-1616) in 1605, and later, with the English Novel Robinson Crusoe by Daniel Defoe(1660-1731) in 1719، it has been established that this genre's roots are grounded in the European Renaissance. However, the emergence of this genre in Urdu literature is greatly indebted to the larger colonial context of the Subcontinent, which along with other revolutionary societal changes, has also transformed the literary landscape by introducing a whole range of new genres schools of thought, of course one of these genres was the Novel itself. Thereby, it is undeniably true that the initial Urdu novelists were greatly influenced by the Western novels and European modes of thinking. These Western novels and ideas worked as a module and specimen for the Urdu novelists, however the standards and poetics of this newly emerged Urdu Novel were not in accordance with the contemporary Western or English novels, in fact, the Urdu novelists were greatly inspired by the Western novels of the Eighteenth century. This article will analyze the initial imprints of the Western novels asserted over the preliminary significant Urdu novelists, i.e., Deputy Nazeer Ahmad, Pandit Ratan Nath Sarshaar,

Maulana Abdul Haleem Sharar, Mirza Hadi Ruswa and Munshi Prem Chand

KEYWORDS:Novel, Genre, Western Impacts, Deputy Nazeer Ahmad, Pandit Ratan Nath Sarshaar, Maulana Abdul Haleem Sharar, Mirza Hadi Ruswa, Munshi Prem Chand

ادب اور زندگی میں تحرّک کا عنصر حیرت آگیں طور پر مشترک ہے۔ جس طرح بذاتِ خود زندگی میں اپنے آپ کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی حیران کُن قوّت موجود ہوتی ہے، ویسے ہی ادب بھی تغیّراتِ زمانہ کے مطابق اپنی جون بدلنے پر قادر ہوتا ہے۔ تاہم، تبدیلی محض تعمیری نوعیت کی حامل ہی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات انقلابات کے راستے میں تخریب کے خلا بھی پاٹنا پڑتے ہیں، تب کہیں جا کر صدیوں سے رائج دستور، رسوم و رواج اور روایات سے بغاوت کرنے کے متعلّق محض سوچنا بھی ممکن ہو پاتا ہے۔ اُردو کی افسانوی نثر نے بھی اپنی جون بدلنے کی خاطر جنگِ آزادی (1857) میں شکست کی صورت میں باقاعدہ ایک آگ اور خون کا دریا عبور کیا ہے۔ اُردو میں ناول کے حادثاتی طور پر رواج پانے کو پہلے ہی اِس باب کے ابتدائیے میں موزوں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ اِس فصل میں اُردو ناول کے تشکیلی برسوں میں مغربی افکار سے اثرپذیری کو بساط بھر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ یوں تو ناول کی صنف ہی مغربی الاصل ہے اور اِس صنف کا اُردو ادب میں چلن ہی مغربی اثرات کی دلیل کی ہے، مگر یہاں یہ دیکھنا مقصود ہے کہ داخلی سطح پر مغربی افکار نے اُردو ناول کو کس حد تک اور کس انداز سے متاثر کیا ہے۔

یہ درست ہے کہ اُردو ادب میں ناول کی صنف کے آغاز کی حقیقت ایک خوشگوار اتّفاق سے زیادہ نہیں، تاہم اِس حسین اتّفاق نے جس انداز سے باقاعدہ ایک رجحان کا درجہ اختیار کیا اور ایک نئی صنف کو ربع صدی سے بھی کم عرصے میں وقیع اور دل خواہ بنایا، اِس کا تجزیہ بھی نہایت معنی خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک بیانیہ صنف ہونے کے ناتے، ناول کی ہیئت تنگ دامانی سے کوسوں دور تھی۔ یہ صنف انسانی تجربے کو نسبتاً سہولت سے احاطۂ فن میں لانے کے حوالے سے بے نظیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں ناول کو دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں چوں کہ برطانوی سامراج برِصغیرِ پاک و ہند کے سینے میں پنجے گاڑ چکا تھا، اور پھر اُس عہد کے آواں گارد اُردو ادیب بھی متنوّع امور کے سلسلے میں حالات کی نزاکت کو پیشِ نظر رکھنے کے سبب حاکموں سے روابط استوار کر چکے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ناول کی صنف بھی اپنے تشکیلی عہد میں حالات اور حاکموں سے ارتباط پر مائل نظر آتی ہے۔ اُردو

کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد(1831-1912)، بذاتِ خود سرکارِ برٹش انڈیا کی ملازمت میں اور برطانوی ماہرِ تعلیم سائمن کمپسن)جس کی فرمائش پر اُنھوں نے اپنے پہلے ناول کی اشاعت یقینی بنائی تھی (کی ماتحتی میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے، جب اُنھوں نے 1869 میں اپنا پہلا ناول مراۃ العروس تصنیف کیا تھا۔ دراصل وہ دور ہی بیرونی تصورّات کے انجذاب کا دور تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے 1869 سے 1892 کے درمیان سات ناول تصنیف کیے ہیں۔ مولوی نذیر احمد، اوّل تو دلّی کالج سے فارغ التحصیل تھے، اور پھر کچھ تو اپنی پیشہ ورانہ مجبوریوں کے تحت، اور کچھ اپنی افتادِ طبع کے باعث بھی، خواہ انگریزی زبان پر کامل دسترس نہ رکھتے ہوں، پر گہری واقفیت ضرور رکھتے تھے۔ پھر ایک اور توجّہ طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ مراۃ العروس) جسے مولوی نذیر احمد کے اپنے بیان کی روشنی میں باقاعدہ اہتمام کے ساتھ ناول لکھنے یا شائع کروانے کی کسی بھی شائبے سے قطعِ نظر، محض اُن کی صاحبزادی سکینہ کی تربیت کے لیے لکھا گیا تھا (بنا شک حادثاتی طور پر وجود میں آیا تھا، مگر یہ بات مولوی نذیر احمد کے بعد میں تصنیف کیے جانے والے ناولوں کے متعلّق نہیں کہی جا سکتی۔ خود مراۃ العروس کی بُنت میں بھی ایسے ناقابلِ تردید شواہد موجود ہیں، جو واضح طور پر نہ صرف اِس پہلو کی جانب اِشارہ کرتے ہیں کہ نذیر احمد انگریزی زبان جانتے تھے، بل کہ یہ خیال بھی قرینِ قیاس لگتا ہے کہ اُن کی رسائی انگریزی ادب کے اوّلین ناولوں تک بھی تھی۔ مراۃ العروس میں اصغری کے نام، اُس کے والد دوراندیش خاں کا خط نقل کیا گیا ہے۔ یہ ایک تعزیتی خط ہے، جس میں اصغری کی نومولود بیٹی کی وفات پر افسوس کا اظہار اور خدا کی مرضی کے حضور راضی بہ رضا رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ انگریزی ناول کی تاریخ میں ڈینیل ڈیفو کے بعد دوسرا سب سے اہم ناول نگار سیمیول رچرڈسن (1689-1761)ہے۔ رچرڈسن کے ناول Pamela(1740) میں پندرہ سالہ پامیلا اپنے والدین کو خط لکھ کر اُنھیں اپنی زندگی میں درپیش اُتار چڑھاؤ سے برابر آگاہ رکھتی ہے۔ Pamelaمیں خطوط کی تعداد زیادہ ہے، تاہم دونوں ناولوں کی مشابہت میں اِس امکان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ممکن ہے مراۃ العروس کو تصنیف کرنے سے قبل نذیر احمد کی نظر سے رچرڈسن کا یہ ناول گزر چکا ہے، اور اِس میں مکتوبات کی اثرپذیری سے متاثر ہو کر نذیر احمد نے بھی یہ حربہ اپنا لیا ہو۔ اِس پہلو کے اثبات میں یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ Pamela میں عصمت کی حفاظت کو خیالیے کا درجہ حاصل ہے۔ نذیر احمد بھی اپنے ناول میں اِس خیالیے کو خاطر خواہ اہمیت دیتے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ٹھوس شواہد ہی اِس مفروضے کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ مراۃ العروس قلم بند کرنے سے پیش تر یا اِس دوران میں نذیر احمد کی نظر سے رچرڈسن کا ناول ضرور گزرا ہو گا۔ اِن اشتراکات کی روشنی میں ڈاکٹر محمّد عظیم اللہ لکھتے ہیں:

> رچرڈسن کا ناول پمیلا تو خطوط ہی پر مشتمل تصنیف ہے۔ فیلڈنگ کے یہاں بھی خطوط پر مشتمل ناول کا سراغ ملتا ہے جو رچرڈسن کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ نذیر احمد بھی رچرڈسن سے متاثر نظر آتے ہیں... رچرڈسن کی کہانیوں میں اخلاقی تعلیمات کا پتہ چلتا ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی بھی اِسی زمرے میں آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ رچرڈسن خطوط کے ذریعے تعلیم دیتا ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں مکالمے سے زیادہ کام لِیا گیا ہے۔(1)

ڈپٹی نذیر احمد کا ناول بنات النعش 1872 میں شائع ہُوا ہے۔ یہ ناول مراۃ العروس کا نصفِ ثانی ہے۔ اِس ناول کا خیالیہ بھی تعلیمِ نسواں ہے۔ برطانوی ناول نگار تھامس ڈے(1748-1789)کے بچّوں کی تربیت کی خاطر لکھے گئے ناول The History of Sandford and Merton(1780) اور بنات النعش کے مابین حیران کُن حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ تھامس ڈے کے ناول میں ٹامی مرٹن (Tommy Merton)برطانوی اشرافیہ خاندان کا ایک بگڑے ہوئے بچّے کے طور پر سامنے آتا ہے، جس کی تعلیم و تربیت کے لیے اُس کا باپ اُسے مسٹر بارلو (Mr. Barlow)کے مکتب میں بھیج دیتا ہے۔ نتیجے کے طور پر، کچھ ہی عرصے میں ٹامی کی بگڑی ہوئی عادتیں رفع ہونے لگتی ہیں، اور وہ ایک تہذیب یافیہ نوجوان کے طور پر پروان چڑھنے لگتا ہے۔ بنات النعش میں اصغری کے مکتب میں حسن آرا کو بالکل اِسی صورتِ حال میں لا کر بٹھایا جاتا ہے، اور وہ بھی کچھ ہی عرصے میں تعلیم و تربیت کے طفیل اپنے لا اُبالی پن کو اعتدال میں لا کر سلیقہ مندی کا دامن تھام لیتی ہے اور زندگی کے میدان میں کامران ٹھہرتی ہے(2)۔

مولوی نذیر احمد کا ناول توبتہ النّصوح 1873 میں شائع ہُوا ہے۔ اِس ناول کا مرکزی کردار نصوح، اپنے گھرانے کا سرپرست ہے۔ نصوح ہیضے میں مبتلا ہو کر غشی کی حالت میں چلا جاتا ہے، دورانِ علالت اُس پر اپنی حیاتِ بعد الموت کا کشف ہوتا ہے اور ہوش میں آنے کے بعد وہ اتنا سراسیمہ ہوتا ہے اور اِس قدر بدک جاتا ہے کہ توبہ تائب ہو کر اپنی زندگی بھر کی غلطیوں کی بھرپائی میں جُت جاتا ہے۔ یوں، نصوح اپنی باقی ماندہ زندگی اپنی اولاد کو راہِ راست پر لانے کی خاطر وقف کر دیتا ہے۔ نذیر احمد کے اِس ناول کی مجموعی فضا پر جان بنیان (1628-1688)کی عیسائیت پرستانہ تمثیل The Pilgrim's Progress(1678) کا مذہبی ماحول چھایا ہُوا ہے۔ بنیان کے قصّے میں بھی مرکزی کردار کرسچین کی خواب میں عیسائیت کے ایک پرچارک سے ملاقات ہے، جس کے احکامات کی پیروی میں کرسچین اپنی گناہ آلود روح کی فلاح کی غرض سے اپنے شہرِ بے اماں کو تج کر، شہرِ مقدّس کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ دونوں کہانیوں کے ابتدائی حصّے، بالخصوص نصوح اور کرسچین کے خوابوں میں اِس حد تک مماثلت ہے کہ یہ مان کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا

کہ نذیر احمد نہ صرف بنیان کی اِس تمثیل سے واقف تھے، بل کہ اِس حد تک متاثر ہوئے تھے کہ اِس تمثیل کے خیالیے کو اپنے ناول کی بنیاد بھی بنا لیا تھا[3]۔

توبتہ النّصوح پر ڈینیل ڈیفو کے ناول A Journal of the Plague Year(1722) کے اثرات بھی بہت گہرے ہیں۔ ڈیفو کے ناول کو 1665 میں لندن شہر میں پھوٹنے والی ہیضے کی وبا پس منظر فراہم کرتی ہے۔ ڈیفو کا ناول ایک ایسے شخص کے تجربات پر مبنی ہے جو خوش قسمتی سے اُس موذی وبا کے دوران موت کی منہ میں جانے سے بچ گیا تھا۔ نذیر احمد کے ناول کا مرکزی کردار نصوح بھی ہیضے کی وبا میں مبتلا ہوتا ہے۔ نذیر احمد کے ناول کا پس منظر واضح نہیں، تاہم توبتہ النّصوح کے تصنیف ہونے سے قبل ہندوستان میں 1817 اور 1857 میں، دو مرتبہ ہیضے کی جان لیوا وبا پھوٹ پڑی تھی، جس کے باعث کافی لوگوں کو ناگاہ لقمۂ اجل بننا پڑا تھا۔ دونوں ناولوں میں وبائی پس منظر محرّکِ اوّل کے طور پر واقعات کو معنی خیز بنانے میں معاون ہے۔ نذیر احمد انگریزی قصّوں سے آشنائی بھی رکھتے تھے، لہٰذا عین ممکن ہے کہ توبتہ النّصوح کی تصنیف کے وقت ڈینیل ڈیفو کا ناول A Journal of the Plague Year اُن کے پیشِ نظر رہا ہو گا۔

مذکورہ بالا مفروضے کے اثبات میں ایک اور نکتہ بھی معاونت کرتا ہے۔ توبتہ النّصوح پر محض ڈیفو کے ناول A Journal of the Plague Year ہی کا اثر نہیں ہے، بل کہ ڈیفو ہی کی ایک اور تصنیف The Family Instructor(1715) کے اثرات بھی بہت واضح ہیں۔ ڈیفو کی اِس تصنیف کا مقصد اولاد کی تربیت اور دینی تعلیمات کے کسب کی ناگزیریت واضح کرنا ہے۔ نصوح کا کردار بھی کشف سے گزر کر اپنی اولاد سے برتی گئی بے توجّہی کی بھرپائی کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے، تاہم اِس کوشش میں نصوح کو جزوی طور پر ہی کامیابی ملتی ہے۔ ڈیفو اور نذیر احمد، دونوں ہی کی تصانیف اپنے اہداف کے تناظر میں بڑی حد تک یکساں نظر آتی ہیں، جس کے باعث اِن مفروضوں کو تقویت ملتی ہے کہ نذیر احمد نہ صرف انگریزی زبان سے خاطرخواہ آشنائی رکھتے تھے، بل کہ ڈیفو کی نگارشات بھی اُن کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ نذیر احمد کا طرزِ احساس وکٹورین ناول نگاروں سے بہت ملتا ہے، اِس ضمن میں ڈاکٹر محمّد عظیم اللہ لکھتے ہیں:

> خانگی، مذہبی اور معاشرتی معاملات و رجحانات کی تصویرکشی کے لحاظ سے ڈپٹی نذیر احمد انگریزی زبان کی مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق ناول نگار جین آسٹن (Jane Austen) سے ایک طرف اور جارج ایلیٹ (George Eliot) سے دوسری طرف بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ اِس قربت میں ڈپٹی نذیر احمد کی رفعت و عظمت کی تابناکی اربابِ فن کی دوررس نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔[4]

ڈپٹی نذیر احمد کے دیگر ناولوں میں ابن الوقت (1888) اور رویائے صادقہ (1892) بھی زندگی کی گھما گھمیوں کی بھرپور عکّاسی کرتے ہیں۔ فسانۂ مبتلا (1885) اور ایّامیٰ (1891) کا کینوس اُن کے باقی ناولوں کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ نسبتاً محدود ہے، بل کہ مؤخرالذّکر دونوں ناول موضوعاتی اعتبار سے بھی مختلف ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے تمام ناولوں میں ایک ہمدردانہ اور دردمندانہ نوعیت کا اصلاحی جذبہ کارفرما ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار (1846-1903) کیننگ کالج، لکھنؤ سے فارغ التحصیل تھے اور انگریزی زبان سے خاطرخواہ حد تک آشنائی رکھتے تھے۔ سرشار نے 12 ناول تصنیف کیے ہیں، تاہم اِن بارہ ناولوں میں فسانۂ آزاد(1885)، جامِ سرشار (1887) اور سیرِ کہسار (1890) کو نسبتاً زیادہ شہرت اور پذیرائی ملی ہے۔ سرشار کا شہرۂ آفاق ناول فسانۂ آزاد چار جلدوں کی صورت میں شائع ہونے سے قبل منشی سجّاد حسین (1856-1915) کے لکھنؤ ہی سے 1877 میں جاری کردہ اُردو ادب کے مشہور و معروف رسالے اودھ پنچ میں دسمبر 1878 سے دسمبر 1879 کے درمیان قسط وار شائع ہوتا رہا ہے(5)۔ دراصل، اودھ پنچ ہی سے وابستہ مزاح نگار پنڈت تری بھوون ناتھ ہجر (1853-1892) کی فرمائش پر پنڈت سرشار نے شہرۂ آفاق ہسپانوی ادیب میگل ڈے سروانتس کے ناول Don Quixote کی طرز پر فسانۂ آزاد لکھنے کا آغاز کیا تھا(6)۔ سرشار، سروانتس کی پیروی میں فسانۂ آزاد لکھنے کے بعد بھی، Don Quixote سے اِس حد تک متاثر تھے کہ اُنھوں نے خدائی فوجدار کے عنوان نے 1903 میں اِس ناول کا باضابطہ ترجمہ بھی کر دِیا تھا۔ جس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے مخصوص مطمحِ نظر سے مطابقت کے باعث انگریزی زبان میں لکھے گئے معاشرتی ناولوں کے اتباع کی کوشش کی، پنڈت سرشار نے، معاشرتی ناولوں کے برعکس، مغربی فکشن میں لکھے گئے پاجی (Picaresque) ناولوں کی پیروی کی ہے۔ پاجی ناولوں میں، جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، ایک پاجی، اوباش یا بدمعاش مگر جاذبِ نظر شخصیت کے حامل مرکزی کردار کو مختلف مہمات سر کرتے ہوئے دِکھایا جاتا ہے۔ سروانتس کے ناول کا ہیرو ڈان کیخوٹے بھی پاجی کرداروں کی طرح ہی پیش آتا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سروانتس نے اِس ناول کو بنیادی طور پر بہادری (Chivalry) کی تصوّر کی تضحیک کرنے کی خاطر تصنیف کیا تھا۔

ناول ڈان کیخوٹے کی کہانی یہ ہے کہ اِس ناول کا مرکزی کردار آلانزو کیشانو ایک ادھیڑ عمر شخص ہے۔ پچاس برس کی عمر میں آلانزو اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اِس دوران میں بہادری کے متعلّق سورماؤں کے قصّے پڑھنا اُس کا واحد مشغلہ تھا۔ آلانزو کیشانو اِن قصّوں سے اِس حد تک متاثر ہُوا کہ اُس نے اِنھیں حرف بہ حرف سچ سمجھ لیا۔ قصّوں میں مختلف سورماؤں کے حالات پڑھنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی ایک مہم جُو بانکا بنے گا۔ آلانزو نے کہیں سے ایک زرہ بکتر تلاش کی، ڈان کیخوٹے کا لقب اختیار کیا، اپنے گھوڑے کا نام روزینانٹے رکّھا، قریبی کھیتوں پر کام کرنے والی ایک لڑکی ڈلسنیا کو اپنی لیڈی) محبوبہ (قرار دِیا اور خود

ساختہ مہم سر کرنے نکل کھڑا ہُوا۔ اِس کے بعد تضحیک آمیز واقعات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اِس دوران میں ڈان کیحوٹے اپنے پڑوسی سینچو پانزا کو بھی اِس شرط پر اپنے ساتھ مِلا لیتا ہے کہ اگر وہ ڈان کیحوٹے کے خدمت گار کے فرائض سرانجام دے گا تو اُسے گورنر بنا دِیا جائے گا، سینچو یہ شرط قبول کر لیتا ہے۔ ناول کے اختتام پر ڈان کیحوٹے اور سانسون کاراکاسو آپس میں کشتی لڑتے ہیں، جس میں ڈان کیحوٹے بری طرح زخمی ہو کر بستر مرگ سے جا لگتا ہے، تاہم بالآخر ڈان کیحوٹے کو ہوش آ جاتا ہے، اور ساتھ ہی اُس کا دماغی توازن بھی درست ہو جاتا ہے۔ آلانزو اپنے کیے پر ہر ایک سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔ وہ اپنی بھتیجی کو اِس واحد شرط پر اپنی جائیداد کا وارث بناتا ہے کہ وہ ہرگز کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کرے گی جو بہادری (Chivalry) کے متعلّق فضول قصّے پڑھتا ہو گا۔

سرشار نے میگل ڈے سروانتس کی پیروی میں، فسانۂ آزاد کے ہیرو آزاد کو ایک آوارہ مزاج، مگر ذہین کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ فسانۂ آزاد درحقیقت آزاد کی مہمات کی کہانی ہے۔ حسن آرا کی فرمائش، کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے، کی تکمیل میں آزاد مہم جوئی کی بدولت نام کمانے کی غرض سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اِن مہمات پر خوجی، آزاد کی مصاحبت میں سائے کی طرح ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ بالآخر مہمات کے پے در پے سلسلوں کے بعد آزاد کامران و شادکام لوٹتا ہے اور حسن آرا سے شادی کر لیتا ہے۔ فسانۂ آزاد اور ڈان کیحوٹے کے مابین مماثلت کے متعلّق معین احمد خان لکھتے ہیں:

> سروانٹیز نے جس طرح یوروپ کی زندگی کے گوشے گوشے کا مشاہدہ کر کے اُس دور کے اِسرار و رموز کو اپنے ناول کے صفحات پر متحرک کر دِیا ہے۔ اُسی طرح فسانۂ آزاد کا موضوع" زندگی " ہوتا ہے۔ چناں چہ سروانٹیز جہاں یوروپ کی معاشرتی و سماجی زندگی کی سچّائیوں کو پیش کرتے ہوئے حجّام کی دوکان سے لے کر کٹھ پتلی کی تماش گاہ تک پہنچ جاتے ہیں وہاں سرشار بھی لکھنؤ کی معاشرتی و تہذیبی زندگی کو پیش کرنے میں پیچھے نہیں رہتے۔ سرشار ادنیٰ و اعلیٰ افراد، امرا و روٴسا سے لے کر محل سراؤں، گلی کوچوں، بازاروں کی رنگارنگی، میلے ٹھیلے، جلوس، محرّم، شادی بیاہ اور میدانِ جنگ، ہر جگہ اپنی نگاہیں ڈالتے ہیں۔ جس سے معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر پہلو سامنے آ جاتا ہے۔ چناں چہ فسانۂ آزاد کی واقعیت میں مغربی فن کا تنوّع ہے۔(7)

فسانۂ آزاد پر سروانتس کے ناول Don Quixote کے اثرات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں، تاہم چند دیگر انگریزی تصانیف اور ناولوں نے بھی اِس ضمن میں سرشار کو متاثر کیا ہے۔ اِن تصانیف میں جوزف ایڈیسن (1672-1719) کا مجموعۂ مضامین The Sir Roger de Coverley Papers (1711) بھی شامل ہے، اِس مجموعے میں شامل مضامین اوائل اٹھارویں صدی کے شہرۂ آفاق رسالے Spectator میں شائع ہوئے تھے۔ اِن مضامین میں ملکہ این (1665-1714) کے زمانے کے ایک فرضی جاگیردار سر روجر کی قابلِ محبّت، مگر مضحکہ خیز شخصیت، جو کہ سماجی سطح پر قدیم چال چلن اور رسوم و رواج کا پروردہ ہے، کے پردے میں اوائل اٹھارویں صدی کے انگریز سماج میں رائج اللّوں تللّوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ سرشار کے زمانے میں سر سیّد احمد خاں کے رسالے تہذیب الاخلاق کی بدولت جوزف ایڈیسن اور رچرڈ اسٹیل (1672-1729) کے مضامین کا بہت چرچا تھا۔ سرشار بھی اِن انگریز مضمون نگاروں سے آشنا تھے۔ فسانۂ آزاد میں مزاح کے پردے میں جہاں معاشرتی بے قاعدگیوں کا ذکر چھیڑا گیا ہے، اُن مقامات پر ایڈیسن کے مجموعۂ مضامین The Sir Roger de Coverley Papers کا واضح اثر دِکھائی دیتا ہے۔

ایڈیسن کے علاوہ، فسانۂ آزاد پر لارنس اسٹرن (1713-1768) کے ناول The Life and Opinions of Tristram Shandy, Gentleman (1759) کا بھی بہت واضح اثر دِکھائی دیتی ہے۔ اسٹرن کے اِس ناول میں مرکزی کردار ٹرسٹرم شینڈی ہی متکلم ہے، شینڈی کی جب پیدائش ہو رہی ہوتی ہے تو اِس عمل کے دوران ایسی مداخلت ہوتی ہے جسے شینڈی اچھا شگون نہیں سمجھتا، پھر ختنے کے دوران اُس کا عضوِ تناسل ڈاکٹر کے تیز دھار آلے سے زخمی ہو جاتا ہے، نتیجے کے طور پر ٹرسٹرم شیڈی نامرد ہو جاتا ہے، بپتسمہ دیتے وقت اُسے غلط نام کے ساتھ Baptize کر دِیا جاتا ہے۔ شینڈی کا بڑا بھائی بوبی اچانک مر جاتا ہے، شینڈی کا باپ اُس کی تربیت کی غرض سے ایک Trista-pedia مرتّب کرتا ہے۔ ناول اپنے نقطۂ عروج پر اُس وقت پہنچتا ہے جب اُدھیڑ عمر میں شینڈی اپنی آپ بیتی لکھنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ بزرگی کے دنوں میں شینڈی اپنی بیماری کے اثرات کم کرنے کے ارادے سے فرانس کا سفر اختیار کرتا ہے۔ ٹرسٹرم شینڈی کی صحت دن بہ دن گر رہی ہوتی ہے، جب وہ اچانک ہی اپنی آپ بیتی کا اختتام کر دیتا ہے۔ اِس سے قطعِ نظر کہ Tristram Shandy میں پہلی مرتبہ شعور کی رو (Stream of Consciousness) کو برتا گیا ہے، جو بات فسانۂ آزاد کے حوالے سے اہم ہے، وہ Tristram Shandy کی اپنے عہد میں ناول کے اصنافی معیارات کے تناظر میں مغائرت ہے، ٹرسٹرم شینڈی انگریزی ادب کا پہلا Anti-novel ہے۔ فسانۂ آزاد کا پلاٹ بھی Tristram Shandy کے مانند کسی بھی منطق سے عاری ہے۔مزید برآں، سرشار نے، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، خود سروانتس کے ناول Don Quixote کا ترجمہ بھی خدائی فوجدار کے عنوان سے کیا ہے، اِس تناظر میں ڈاکٹر زاہرہ نثار لکھتی ہیں:

سرشار نے ڈان کیوخاتے کا ترجمہ خدائی فوجدار کے عنوان سے کیا۔
اِس ترجمے میں" ڈان "کو" خدائی فوجدار "اور" سانچوپانزا "کو" بڈّھو
نفر "کے ناموں سے مخاطب کیا ہے۔ فسانۂ آزاد میں یہی
"ڈان"خوجی کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ دونوں کردار معمول کی روش
پر چلتے چلتے اچانک غیر معمولی حرکات سے قاری کی دل بستگی کا
سامان فراہم کرتے ہیں۔(8)

سرشار کے دیگر ناولوں میں کامنی(1894)، کڑم دھم(1894)، بچھڑی ہوئی دلہن(1894)، پی کہاں(1894)، ہشّو (1894)اور طوفانِ بے تمیزی (1894)کے علاوہ دو غیر مطبوعہ اور ادھورے ناول چنچل ناڑ(1899)اور گورِ غریباں (1899)بھی شامل ہیں۔ سرشار کے ناولوں پر سروانتس، ایڈیسن اور اسٹرن کے علاوہ سیمیول رچرڈسن، ہنری فیلڈنگ(1707-1754)، ٹوبیاس اسمولیٹ(1721-1771)، والٹر اسکاٹ (1771-1832)اور ولیم میک پیس تھیکرے (1811-1863)کے ناولوں کے اثرات کا بھی بعض مقامات پر شائبہ ہوتا ہے۔ البتہ چارلس ڈکنز (1812-1870)کے ناولوں، بالخصوص The Pickwick Papers(1836) کے اثر کا سرشار کے یہاں اکثر مقامات پر شائبہ ہوتا ہے۔شاید یہ شائبہ دونوں ناول نگاروں کے Picaresque ناولوں کے باعث ہوتا ہے۔ بہرحال سرشار کے تمام ناولوں کے مقابلے میں فسانۂ آزاد میں جس کامیابی سے مغربی ناول نگاروں کے فن کا انجذاب ہُوا، اُس کی نظیر انیسویں صدی کے مغربی ناولوں سے اثر پذیر اُردو ناولوں میں ملنا ناممکن ہے۔

عبدالحلیم شرر (1860-1926)اوّلین دور کے اُردو ناول نگاروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ شرر علی گڑھ تحریک کے ساتھ نظریاتی طور پر وابستہ تھے۔ جس طرح ڈپٹی مولوی نذیر احمد نے معاشرتی ناول اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے پاجی ناول کو فروغ دِیا، اُسی طرح عبدالحلیم شرر بھی تاریخی ناول کی رجحان سازی میں نقیب کا درجہ رکھتے ہیں۔ تاریخی ناول کی سلسلے میں سر والٹر اسکاٹ کا مرتبہ بہت بلند ہے، اور اِسی بلند مرتبے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے شرر کو اُن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شرر نے معاشرتی ناول بھی لکھے ہیں، لیکن اُن کی اصل شہرت تاریخی ناولوں ہی کی مرہونِ منّت ہے۔ شرر کی ایک اور وجہِ شہرت اُن کی بسیار نویسی بھی ہے، دیگر تصانیف کے علاوہ اُنھوں نے 1886 سے لے کر 1925 تک کے عرصے میں 31 ناول تصنیف کیے ہیں، یہ تعداداُن کے ایک غیر مطبوعہ ناول اور ایک ترجمہ شدہ ناول کے علاوہ ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں ناول لکھنے کی وجہ پیشہ ورانہ مجبوری بھی تھی، اور اُن کے کئی ناول محض روزگار ہی کے سلسلے میں تصنیف ہوئے ہیں۔ یوں تو شرر کے سبھی ناول معقولیت کے زمرے میں آتے ہیں، تاہم اُن کا شہرۂ آفاق ناول

فردوسِ بریں (1899) ہے۔ شرر کی اُردو ناول کے باب میں خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے معین احمد خان لکھتے ہیں:

> عبدالحلیم شرر وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے مغربی فن کے مطالبات کو مشرقی مزاج سے ہم آہنگ کیا۔ اور اُردو زبان میں ناول نگاری کی باضابطہ ابتدا ہی نہیں کی بل کہ انگریزی لفظ" ناول "کو بھی اُردو میں رائج کیا۔[9]

شرر کا پہلا تاریخی ناول ملک العزیز ورجنیا(1888)، جو 1887 سے شرر ہی کے جاری کردہ اُردو کے معروف رسالے دلگداز میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے، یہ ناول دراصل سروالٹر اسکاٹ کے ناول Talisman(1825) کے جواب میں تصنیف کیا گیا ہے۔ اسکاٹ کے اِس ناول کا پس منظر تیسری صلیبی جنگ ہے۔ اِس ناول میں اسکاٹ کی جانب سے مسلمانوں کی بحیثیتِ قوم جس انداز سے پیش کش کی گئی، وہ نہ صرف شرر کو کھٹکی، بل کہ ایڈورڈ سعید (1935-2003) نے بھی اِس موضوع پر اپنی کتاب Orientalism(1978) میں خاصی وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔ ایّوبی سلطنت کے بانی اور فاتح بیت المقدّس سلطان صلاح الدّین ایّوبی) متوفّی(1193 :، جنھوں نے تیسری صلیبی جنگ (1189-1192) میں مسلمانوں کی قیادت کی تھی، نسلی اعتبار سے کُرد تھے اور والٹر اسکاٹ نے اپنے ناول طلسمان میں کُردوں کو شیطان کی اولاد قرار دِیا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی، اگرچہ اسکاٹ نے اِس ناول میں کافی مقامات پر مسلمانوں کو مثبت انداز میں بھی پیش کیا ہے، مگر ہمیشہ اُنھیں یورپی النّسل صلیبی جنگجوؤں کے مقابلے میں نسلی اعتبار سے کم تر دِکھایا ہے۔ اِنھیں وجوہ کی بنیاد پر شرر نے ملک العزیز ورجنیا تصنیف کیا، جس کا مرکزی کردار ملک العزیز ہے، جو کہ سلطان صلاح الدّین ایّوبی کے حقیقی بیٹے الملک العزیز عثمان (1171-1198) کو بنیاد بنا کر وضع کیا گیا ہے۔

سر والٹر اسکاٹ کے بعد عبدالحلیم شرر کو جس ناول نگار نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ جارج ولیم میک آرتھر رینالڈس (1814-1879) ہے۔ رینالڈس کے ناولوں The Mysteries of London(1844) اور The Mysteries of the Court of London(1856)، جن میں لندن شہر کی زندگی کے گوناگوں پہلو پیش کر کے سماجی نظام پر چھائی ہوئی بدعنوانی، غربا کا استحصال اور ناانصافی کو پیش کیا گیا ہے، سے متاثر ہو کر عبدالحلیم شرر نے دلچسپ(1886)، دلکش(1893)، بدرالنسا کی مصیبت(1901)، خوفناک محبّت (1915) اور دربارِ حرام پور (1925) ایسے معاشرتی ناول تصنیف کیے ہیں۔ شرر کے معاشرتی ناولوں پر رینالڈس کے علاوہ الیگزانڈر ڈوما (1802-1870) کے ناول The Three Musketeers(1844) کے اثرات کا بھی شائبہ ہوتا ہے۔ ڈوما کا ناول بھی معاشرتی ناانصافیوں کو موضوع بناتا ہے۔ اِس کے علاوہ شرر کے ایک تاریخی ناول

جویائے حق (1921) کی ہیئت پر رچرڈسن اور فیلڈنگ کے گہرے اثرات مرتسم ہیں، جویائے حق بھی Pamelaاور Joseph Andrews(1742) کی طرح مکتوباتی انداز میں تصنیف کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا ناولوں کے علاوہ شرر نے حسن انجلینا(1889)، منصور موہنا(1890)، فلورا فلورنڈا(1898)، ایّامِ عرب(1900)، مقدّس نازنین(1900)، فتحِ اندلس(1904)، یوسف و نجمہ(1906)، شوقین ملکہ(1906)، قیس و لبنیٰ(1908)، آغا صادق کی شادی(1908)، ماہ ملک(1908)، غیب دان دلہن(1910)، فلپانا(1910)، زوالِ بغداد(1912)، رومۃ الکبریٰ(1913)، حسن کا ڈاکو(1914)، الفانسو(1915)، مفتوح فاتح(1916)، بابک خرّمی(1918)، لعبتِ چین(1919)، عزیزۂ مصر(1920)، اسیر بابل(1920)، طاہرہ (1923)اور مینا بازار (1925)بھی تصنیف کیے ہیں۔ مزید برآں، شرر کا اک غیر مطبوعہ ناول نورجہان (1926)بھی ہے، جب کہ منشی محمّد امیر مرزا کے انگریزی سے ترجمہ شدہ ناول ڈاکو کی دلہن (1901)کی عبارت بھی شرر ہی نے درست کی ہے، اور یہ ناول بھی اُن کے نام سے ہی منسوب کیا جاتا ہے۔ تاہم، اِن میں سے بیش تر ناول پیشہ ورانہ ضروریات کے تحت تصنیف ہوئے ہیں۔ شرر کے ناولوں میں جیسا مقام و مرتبہ فردوسِ بریں کے حصّے میں آیا، ویسی شہرت اُن کے کسی دوسرے ناول کو نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ اُن کے بیش و کم تمام ناولوں پر اسکاٹ اور رینالڈس کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ غرضے کہ بیسویں صدی تک آتے آتے، اُردو ناول میں نوآوارد مغربی افکار کے اثرات کو جذب کرنے اور رواج دینے کی خاطر جس وسیع النّظری کی ضرورت تھی، وہ عبدالحلیم شرر کی صورت میں ظہور پذیر ہو چکی تھی۔

مرزا محمّد ہادی رسوا (1857-1931)اُردو زبان میں لکھے گئے چنیدہ اہم ناولوں میں سے ایک، امراؤجان ادا(1899)، کے مصنّف کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ رسوا زندگی بھر درس و تدریس اور ترجمہ و تالیف ایسے مشاغل میں مصروف رہے۔ وہ کرسچین کالج، لکھنؤ اور ازابیلا تھوبرن کالج، لکھنؤ سے بطور لیکچرر وابستہ رہے۔ بعدازاں وہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے شعبۂ تالیف و ترجمہ سے بھی وابستہ رہے، جہاں اُنھوں نے کئی علمی تراجم یادگار چھوڑے۔ رسوا نے پانچ طبع زاد ناول تصنیف کیے ہیں۔ جن میں اُن کے دوسرے ناول امراؤ جان ادا کے علاوہ افشائے راز(1896)، ذاتِ شریف(1900)، شریف زادہ (1900)اور اختری بیگم (1924)شامل ہیں۔ افشائے راز، پہلا ناول ہونے کے ناتے، نہ صرف یہ کہ فنی سطح پر اُن کے بعد میں تصنیف کیے جانے والے ناولوں سے کمزور ہے، بل کہ نامکمّل بھی ہے۔ رسوا کے ناولوں میں پہلی مرتبہ کرداری نفسیات اور واقعاتی ترتیب میں تنازعات کی فن کارانہ پیش کش ملتی ہے۔ جس طرح نذیر احمد نے سوانحی ناول، سرشار نے پاجی ناول اور شرر نے تاریخی ناول کو فروغ دینے میں اپنی خدمات سرانجام دیں، اُسی طرح رسوا نے شریف زادہ کی بدولت اُردو ادب میں سوانحی ناول کے لیے راہیں ہموار کی

ہیں۔ اِس ناول کے مرکزی کردار مرزا عابد حسین کی شخصیت میں مرزا ہادی رسوا کا اپنا عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ شریف زادہ بعدازاں اُردو ادب میں لکھے گئے سوانحی ناولوں کے مقابلے میں خواہ کمزور ہو، تاہم بطورِ سوانحی ناول اِسے اوّلیت کا شرف ضرور حاصل ہے۔ اُن کی بطورِ ناول نگار انفرادیت کے متعلّق ڈاکٹر توحید خاں لکھتے ہیں:

> مرزا رسوا فن کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ نہ تو نذیر احمد کی طرح اصلاح کے علم بردار تھے، نہ سرشار کی طرح محض ظرافت کے رسیا تھے اور نہ شرر کی طرح ماضی کے پرستار تھے۔ وہ سب سے پہلے ایک فن کار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا فنی شعور اپنے پیش رووں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پختہ ہے۔[10]

مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کو اُردو ناول میں ایک خاص مقام تفویض کیا گیا ہے۔ یہ ناول نہ صرف اپنے موضوعاتی برتاؤ میں ندرت کا حامل ہے، بل کہ اِس ناول کی تکنیک بھی اچھوتی ہے۔ انگریزی ادب کی معروف ناول نگار ایمیلی برونٹے (1818-1848)کے ناول Wuthering Heights (1847)کی تکنیک اور امراؤ جان ادا کی تکنیک میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں ناولوں میں فلیش بیک (Flashback) کی تکنیک برتی گئی ہے۔

Wuthering Heights کی معتدبّہ کہانی بھی فلیش بیک کے حربے کو بروئے کار لا کر بتائی گئی ہے۔ کہانی کی ابتدا میں لاک ووڈ کرائے پر تھرش کراس گرینج (Thrushcross Grange)حاصل کرتا ہے، جس کا مالک ہیتھ کلف ہے اور جو خود ودرنگ ہائیٹس پر مقیم ہوتا ہے۔ لاک ووڈ اُس سے ملنے کی غرض سے ودرنگ ہائیٹس جاتا ہے اور اگلے ہی روز اپنے کرائے کے مکان میں واپس آ جاتا ہے، اور اُسی طوفانی رات میں لاک ووڈ کو کیتھی کا بھوت ہراساں کرتا ہے۔ صبح گھریلو ملازمہ لاک ووڈ کو ہیتھ کلف اور کیتھی کی کہانی سناتی ہے، کہ کس طرح لاوارث اور بے گھر ہیتھ کلف کو مسٹر ارن شا اپنے گھر لائے اور اپنے بچوں، کیتھی اور ہنڈلے کی معیّت میں پالا پوسا۔ تاہم، نوجوان ہو کر کیتھی سے شادی نہ ہونے کے باعث ہیتھ کلف غم و غصّے کے جذبات میں ڈوب کر کیتھی کے گھرانے اور لنٹن گھرانے) کیتھی کا سسرال (سے بدلہ لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ناول کے بیش و کم تمام واقعات اِسی بدلے کے اردگرد گھومتے ہیں، اور ہیتھ کلف بدلہ لینے میں جزوی طور پر کامیاب بھی ہو جاتا ہے، مگر یہ انتقام کی آگ اُسے خود بھی جلاتی رہتی ہے اور ایک دن وہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں وقت سے پہلے ہی موت کے شکنجوں میں جکڑا جاتا ہے۔ ناول کا اختتام کیتھی کی بیٹی کیتھرین اور ہنڈلے کے بیٹے ہیرٹن کی متوقّع شادی کے مژدے پر ہوتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤجان میں مرکزی کردار امراؤ اپنی آپ بیتی کو فلیش بیک ہی کے حربے کو بروئے کار لا کر بیان کرتی

ہے۔ امراؤ کی بیان کردہ کہانی ہی سے قاری کو علم ہوتا ہے کہ امراؤ پیدائشی طور پر طوائف نہیں تھی، بل کہ ایک شریف زادی تھی، اور درحقیقت حالات کی ستم ظریفی اور کوتاہ بختی نے اُسے گھر کی چار دیواری کی عافیت سے نکال کر بھرے بازار میں رسوا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

رسوا کے ناول ایمیلی برونٹے ہی کے فنی اثرات کے انجذاب پر اکتفا نہیں کرتے، بل کہ اُن کے ناولوں پر مقبول جاسوسی ناولوں کا اثر بھی پڑا ہے۔ رسوا نے دراصل کئی مقبول جاسوسی ناول بھی تصنیف کیے ہیں، جن میں خونی شہزادہ، خونی بھید، بہرام کی واپسی، خونی عاشق، خونی جورو اور خونی مصوّر وغیرہ شامل ہیں۔ مگر اِن ناولوں میں اُنھوں نے مغرب کے جاسوسی ناولوں کا چربہ پیش کیا ہے اور اِن ناولوں کو تراجم ہی کے ذیل میں شمار کیا جانا چاہیے۔ تاہم، اِن جاسوسی ناولوں کے اثرات رسوا کے دیگر ناولوں میں بھی جا بجا دِکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اُن کے ناول اختری بیگم میں اختری کے خورشید مرزا کے گھر جانے کے بعد واقعات کا جو تسلسل شروع ہوتا ہے، وہ کسی جاسوسی ناول کا منظرنامہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی صورتِ حال شریف زادہ کی ہے، جس میں مرزا عابد حسین کی زندگی میں در آنے والی آزمائشوں اور مشکلات سے نبرد آزمائی کے دوران میں ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں، جن پر کسی جاسوسی ناول کا گمان ہوتا ہے۔ الغرض، مرزا ہادی رسوا کے ہاتھوں میں اُردو ناول نے نہ صرف یہ کہ کرداری نفسیات کی پیش کش کے امکانات ظاہر کیے ہیں، بل کہ فنی حوالوں سے بھی کئی مراحل ایک ہی جست میں طے کیے ہیں۔

منشی پریم چند (1880-1936)کا پیدائشی نام دھنپت رائے شریواستوا تھا۔ پریم چند ناول نگاری اور افسانہ نگاری، ہر دو حوالوں سے شہرت یافتہ ہیں۔ پریم چند نے مشنری اسکول میں دورانِ تعلیم رینالڈس کی تصنیف The Mysteries of the Court of London اور اِس قماش کی چند دیگر مغربی کتب کے متعلّق نہ صرف یہ کہ سنا، بل کہ اِن تصانیف کا مطالعہ بھی کیا۔ یہی تصانیف اُن کی افسانوی فصیل میں مغربی افکار کی اوّلین زقند کا درجہ رکھتی ہیں۔ پریم چند نے تیرہ ناول لکھے، جن میں اِسرار معابد05)٫(1903، ہم خرما و ہم ثواب(1904)، جلوۂ ایثار(1912)، بازارِ حسن(1916)، گوشۂ عافیت(1920)، نرملا(1922)، چوگانِ ہستی(1924)، پردۂ مجاز(1925)، بیوہ(1927)، غبن(1930)، میدانِ عمل(1931)، گئودان (1935)اور ایک نامکمّل ناول منگل سوتر (1936)شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ پریم چند کے ایک نایاب ناول کرشنا (1904) کا بھی ذکر ملتا ہے۔ پریم چند اُردو ادب کی ایک عہد آفریں شخصیت ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی افسانوی نگارشات میں ہندوستان کی سماجی صورتِ احوال کی معنی خیز عکّاسی کی ہے، بل کہ اثر پذیری کے اعتبار سے بھی شاید ہی کسی اور فکشن نگار نے آئندہ نسلوں کو اتنا متاثر کیا ہو، جتنا کہ تنہا پریم چند نے کیا ہے۔ اُن کی نگارشات میں ہندوستانی زندگی واقعیت سے مملو دِکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست (1936-2019)

پریم چند کا شہرۂ آفاق فرانسیسی ناول نگار اونورے ڈے بالزاک (1850-1799) سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پریم چند ہر لحاظ سے کسی نہ کسی حد تک بالزاک سے مشابہت رکھتے ہیں اِس لیے اُنھیں ہندوستان کا بالزاک کہا جس سکتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بالزاک کی طرح عظیم نہیں ہیں کیوں کہ اُن کے ناولوں میں زندگی کو اتنی ہمہ گیری، اتنی وسعت، اتنی گیرائی اور گہرائی کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ بالزاک نے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے اور پھر یہ کہ زندگی کو جس بھرپور طریقہ پر اور جس تکمیل کے ساتھ بالزاک پیش کرنے کی قدرت و قوّت رکھتا ہے وہ بھی پریم چند کو حاصل نہیں لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود پریم چند نے چھوٹے پیمانے پر اور کم تر درجہ پر وہی کچھ ہندوستان کے ساتھ کیا جو بالزاک نے فرانس کے ساتھ کیا ہے۔ جس طرح بالزاک کے عہد کے فرانس کی زندگی کو سمجھنے کے لیے اُس کے ناولوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے بالکل اُسی طرح پریم چند کے زمانے کے ہندوستان کی زندگی کو سمجھنے کے لیے اُن کے ناولوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔(11)

اُردو کے افسانوی ادب میں پریم چند کی اہمیت مسلّم ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف ہندوستانی زندگی کی عکّاسی کی، بل کہ اپنے عہد کے معاشی مسائل اور طبقاتی سطح پر نچلے طبقوں کے غیر منصفانہ استحصال پر بھی اُن کی گہری نظر تھی۔ تاہم، یہ طبقاتی شعور الل ٹپ یا روزِ اوّل سے موجود نہیں تھا، پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں ایک مخصوص قسم کی رومانیت واضح طور پر جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ علی عبّاس حسینی (1969-1897) اِس کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پریم چند کے جن ناولوں] بیوہ، بازارِ حسن، نرملا)کا اب تک ذکر آیا ہے وہ حقیقتاً رومان ہیں۔ اُن میں ڈکنس کی تصنیفات کی طرح معاشرت کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سب اُسی وقت کی چیزیں ہیں جب ملازمت کا جُوا اُن کی گردن میں پڑا تھا۔ جب 1921 کی عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں اُنھوں نے نوکری کی پاپوش اُتار دی تو پھر اُن کا قلم زیادہ بے باکیاں دِکھانے لگا۔ اِس

زمانے کے ناول گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی، میدانِ عمل اور گئودان ہیں۔ (12)

پریم چند اپنے ناول گوشۂ عافیت میں طبقاتی کشمکش کی آڑ میں موہن داس کرم چند گاندھی (1869-1948) کے وچاروں کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ اِس ناول پر عظیم روسی ناول نگار لیو ٹالسٹائی (1828-1910) کے ناول (1899)Resurrection کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ ٹالسٹائی کا یہ ناول منظّم مذہب کے اخلاقی دیوالیہ پن اور غیر منصفانہ طور پر نافذ شدہ معاشرتی قوانین پر نوحہ کناں ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ڈمیٹری ایک کسان لڑکی کتیرینا سے پیار جتاتا ہے، مگر جب وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو ڈمیٹری اُس سے شادی کے بندھن میں بندھنے سے منکر ہو جاتا ہے۔ بعدازاں کتیرینا ایک طوائف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کئی برس بعد، ڈمیٹری کا کتیرینا سے اُس وقت کمرۂ عدالت میں آمنا سامنا ہوتا ہے، جب وہ ایک ایسے شخص کے قتل کے الزام میں مقدّمہ بھگت رہی ہوتی ہے، جس کا اُس نے قتل نہیں کیا ہوتا۔ اِس واقعے کا ڈمیٹری پر ایسا گہرا اثر ہوتا ہے کہ اُس کی روحانی سطح پر کایا پلٹ جاتی ہے۔ ڈمیٹری اپنے رویّے میں ترمیم کرتا ہے۔ اور کتیرینا کے ساتھ کی گئی زیادتی کا احساس کر کے، اِس گناہ کی پاداش میں پوری تن دہی سے اُس کی مدد کرنے میں جُت جاتا ہے۔ کتیرینا پر بالآخر جرم ثابت نہیں ہوتا، تاہم اِس دوران دو کردار، کتیرینا کی سہیلی ماریہ اور کتیرینا کا منگیتر، ایسے سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنی پُرآسائش زندگیوں کو تج کر طبقاتی کشمکش کے خلاف جدوجہد کے لیے خود کو وقف کر دِیا ہوتا ہے۔ ناول کے اختتام پر کتیرینا کی شادی اُس کے منگیتر سے ہو جاتی ہے اور ڈمیٹری کو ہمیشہ کے لیے کتیرینا کی جدائی گوارا کرنا پڑتی ہے۔ یہ ناول شخصی ایثار کی تبلیغ کرتے ہوئے، استدلال اور انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔

پریم چند کے لیے یہ خیالیے بہت جاذبِ نظر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ناول کا مرکزی کردار منوہر اور بلراج ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ظلم کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ ناول کا ہیرو پریم شنکر اور مایا شنکر دونوں ہی ٹالسٹائی کے انسان دوستی کے ماڈل پر پورے اُترتے ہیں۔ یہاں ایک کردار سیّد ایجاد حسین کا ذکر ضروری ہے، سیّد ایجاد حسین کی بھی ڈمیٹری کے مانند روحانی طور پر کایا پلٹتی ہے۔ الغرض پریم چند کا یہ ناول گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک کے منشور اور ٹالسٹائی کے ناول Resurrection کے اثرات سے لبریز ہے۔ پریم چند کا اپنا اعتراف ہے کہ اُنھوں نے ایک زمانے میں رینالڈس کے جاسوسی ناولوں کے کئی تراجم پڑھے ہیں (13) ۔ اُن جاسوسی ناولوں کے اثرات ہم خرما و ہم ثواب میں کئی سنسنی خیز مقامات پر ملتے ہیں، ایسا ہی ایک پُر تجسّس مقام تب آتا ہے جب پُورنا اور دین ناتھ ایک دوسرے کو گولی مار کر ختم کر دیتے ہیں۔ گوشۂ عافیت کے علاوہ معاشرتی اصلاح کے ضمن میں پریم چند کے ناول بازارِ حسن، نرملا اور غبنقابلِ ذکر ہیں۔ بازارِ حسن کے متعلّق علی عبّاس حسینی لکھتے ہیں:

> انگریزی میں اِس طرح کے ناول بکثرت ملتے ہیں جن میں کسی شریف گھر کی بہو لڑ جھگڑ کر تھیٹر میں نوکری کر لیتی ہے۔ وہاں منیجر اور مالک اُس پر ڈورے ڈالتے ہیں۔ ایکٹر اُسے دامِ تزویر میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں اور شوقین مزاج رؤسا اُسے رام کرنے کی مختلف تدبیریں عمل میں لاتے ہیں۔ لیکن وہ" برف کی قاش "کی طرح نہیں پگھلتی بل کہ تمام سازشوں سے طلسمِ ہوش ربا کے فاتحین کی طرح ہمیشہ صحیح و سالم و باعصمت نکل کر کسی شریف آدمی سے بیاہ کر کے آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرتی ہے۔ پریم چند نے بھی اِسی طرح کا ایک مثالی کردار" سمن "میں پیش کیا ہے اور اِس ضمن میں ہندوستانی معاشرت و رسوم و رواج کے خلاف پُرزور صدائے احتجاج بلند کی ہے۔(14)

پریم چند کے اصلاحی ناول نرملا پر انگریز ناول نگار تھامس ہارڈی (1840-1928) کے ناول Tess of the d'Urbervilles (1891) کے اثرات واضح طور پر دِکھائی دیتے ہیں۔ ہارڈی کے ناول میں ٹیس ایک غریب دیہی گھرانے سے تعلّق رکھتی ہے، باپ کی ایما اور حلقے کے پادری کی سفارش پر اُسے ڈربرولز خاندان کے پس ماندگان کے یہاں ملازمت مل جاتی ہے، وہیں سلوپس پر ٹیس کی ملاقات ایلک سے ہوتی ہے، ایلک، ٹیس کو ورغلا کر اُس سے جنسی ربط اُستوار کر لیتا ہے اور ٹیس حاملہ ہو کر گھر چلی جاتی ہے، جہاں وہ اپنے ناجائز بیٹے سورو کو جنم دیتی ہے، سورو بچپن ہی میں بیمار پڑ کر فوت ہو جاتا ہے۔ سورو کے غم میں ٹیس بے حال ہو جاتی ہے اور گھر سے دور ٹالبٹ ہیز ڈیری)فارم (پر کام کرنے لگتی ہے، وہاں ٹیس کی ملاقات اینجل سے ہوتی ہے، اینجل فوراً ہی ٹیس کی محبّت میں گرفتار ہو کر اُس سے شادی کی درخواست کرتا ہے، ٹیس اوّلاً تو انکار کر دیتی ہے مگر اینجل کے اِسرار پر بالآخر مان جاتی ہے۔ تاہم، شادی کی پہلی رات ہی اینجل کو ٹیس اپنا ماضی صاف صاف بتا دیتی ہے۔ اینجل وقتی طور پر سیخ پا ہو کر برازیل چلا جاتا ہے۔ اینجل کی بے رخی کے بعد ٹیس فلنٹکوم ایش فارم پر کام کرنے لگتی ہے۔ وہاں ٹیس کی ملاقات ایک پھر ایلک سے ہوتی ہے جو اب ایک گشت لگانے والے پادری کا سوانگ بھر چکا ہوتا ہے۔ ایلک ایک بار پھر ٹیس کی جانب مائل ہوتا ہے، ٹیس شروع میں تو انکار کرتی ہے مگر ماں کی دن بہ بدن گرتی صحت اور شدید مالی بدحالی سے مجبور ہو کر ایلک کی داشتہ بن کر سینڈبرن میں رہائش اختیار کر لیتی ہے۔ اُدھر اپنے کیے پر نادم اینجل برازیل سے لوٹ کر صورتِ حال کا ادراک کر کے ٹیس کے پاس جاتا ہے، مگر ٹیس اُس کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ ٹیس اور ایلک کے درمیان اِس بدلی ہوئی صورتِ حال پر تلخ کلامی ہوتی ہے اور تیش کے عالم میں ٹیس ایلک کے سینے میں

خنجر بھونک دیتی ہے۔ بعدازاں ٹیس اینجل کو تلاش کر کے اُسے صورتِ احوال سے آگاہ کرتی ہے، دونوں ایک ہفتے تک پولیس سے بھاگے پھرتے ہیں، اِس دوران میں دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ چند مسحور کُن لمحات بھی میسّر آتے ہیں، مگر بالآخر سٹون ہینج کے مقام پر دھر لیے جاتے ہیں۔ پھانسی کی سزا پر عمل درآمد ہونے سے قبل ٹیس اپنی آخری خواہش کے طور پر اینجل سے عہد لیتی ہے کہ وہ اُس کی چھوٹی بہن لیزالو سے شادی کر لے، اینجل مان بھی جاتا ہے۔

پریم چند کے ناول نرملا میں اقتصادی حالات سے ستائی ہوئی ایک لڑکی نرملا اپنی حالت سدھارنے کی غرض سے ایک سن رسیدہ وکیل طوطا رام سے شادی کر لیتی ہے، جس کا پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والا بیٹا بھی گھر میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے، جو اب نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہوتاہے۔ طوطا رام اپنی بڑی عمر کے باعث اِس شبہے کا شکار ہو جاتا ہے کہ اُس کی نوجوان بیوی کا اُس کے لڑکے کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر گھر کے ماحول میں کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ طوطا رام کا نوجوان لڑکا تو اِس گھناؤنے الزام کے عائد ہونے پر صدمے سے دوچار ہو کر مر جاتا ہے۔ خود طوطا رام بھی گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے، جب کہ نرملا بھی بالآخر کرب کے عالم میں جان دے دیتی ہے۔ ہارڈی اور پریم چند، دونوں ہی کے ناولوں میں بنا تحقیق کیے بیویوں پر الزام دھر دِیا جاتا ہے اور اُنھیں صفائی کا موقع بھی نہیں دِیا جاتا۔ نتیجے کے طور پر گھر کا سارا نظام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ نرملا اور Tess of the d'Urbervilles میں بیوی کی عصمت پر شک کرنے کا خیالیہ یکساں ہے، اور یہی وہ مرکزی نکتہ ہے جس کے گرد دونوں ناولوں کی کہانیاں گردش کرتی ہیں۔ نرملا اور پریم چند کے ایک اور ناول غبن پر ٹالسٹائی کے ناول Anna Karenina(1877)کے بھی اثرات نظر آتے ہیں۔ ٹالسٹائی کے اِس ناول کی ہیروئن اینا، نرملا کی ہیروئن نرملا اور غبن میں شامل ضمنی کہانیوں کے نسوانی کرداروں کے پردے میں عورت کی عصمت کے تصوّر کے حوالے سے معاشرتی اور سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غبن پر فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو (1802-1885)کے ناول Les Misérables(1862) کی پرچھائیں بھی محسوس ہوتی ہے، جب کہ اِس ناول کی تصنیف سے کچھ ہی عرصہ قبل پریم چند نے جان گالزوردی (1867-1933)کے دو ڈراموں The Silver Box(1906)اور Justice(1910) کو ہندی زبان کے قالب میں ڈھالا تھا۔ پریم چند اِن دونوں ادیبوں کے انسان دوستانہ مؤقف کے باعث اِن سے فکری و نظریاتی سطح پر ہم آہنگ تھے۔

پریم چند کے نسبتاً طویل ناول چوگانِ ہستی پر ٹالسٹائی کے ناول War and Peace(1867) کے واضح اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں ٹالسٹائی کے ناول جنگ اور امن کو نپولین بوناپارٹ (1769-1821)کی روس پر یلغار (1812)پس منظر فراہم کرتی ہے، وہیں پریم چند کے ناول چوگانِ ہستی میں گاندھی جی کی عدم تشدّد کی سیاست کارفرما نظر آتی ہے۔ چوگانِ ہستی کا کینوس، جنگ اور امن کے مانند، بے حد وسیع ہے۔ اِس ناول

میں پورے ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی ترجمانی کی گئی ہے، شاید ہی کوئی فرقہ، کوئی طبقہ ایسا ہو جسے اِس ناول میں فراموش کیا گیا ہو، وگرنہ ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی خانگی زندگیوں سے لے کر انگریز حاکموں کے عناد تک، پریم چند نے ٹالسٹائی کی تقلید میں، سبھی کچھ اِس ناول میں شامل کیا ہے۔ پریم چند درحقیقت، شاید مہاتما گاندھی جی کے بعد، ٹالسٹائی سے بھی عقیدت کی حد تک مرعوب تھے، اپنے ایک مضمون "کاؤنٹ ٹالسٹائی اور فنونِ لطیفہ "میں لکھتے ہیں:

> ٹالسٹائی نے مساوات پر اپنی ساری ثروت اور سارا وقار قربان کر دیا۔ وہ محض تباہ کُن نکتہ چیں نہیں ہیں، اُن میں سالکانہ صداقت اور جوش موجود ہے۔ اُن کے دل میں شہیدوں کی دُھن ہے۔ پیمبروں کا اعتقاد ہے۔ وہ اصولوں کے مقابلہ میں شخصوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ ریا اور ظاہر پرستی سے اُنھیں نفرت ہے۔ رواج کی غلامی کو وہ بدترین غلامی خیال کرتے ہیں۔ دنیا ایسی نمائش پرست ہو گئی ہے کہ آج سچّی بات کہنے والا آدمی کافر سمجھا جاتا ہے۔ ٹالسٹائی نے مذہبی تصرّفات اور انحرافات کا پردہ فاش کیا۔ اِس کے لیے دنیا نے اُن پر ایجاد کا فتویٰ صادر کیا۔ وہ سچّے اصولوں کے موئد تھے۔ دنیا نے اُنھیں بے دین خیال کیا۔ وہ مساوات کے عملی پیرو تھے۔ دنیا نے اُنھیں فاترالعقل بتلایا۔ یہاں تک کہ اکثر ادیبوں نے اُنھیں اپنے زندہ دلانہ کنایات کا نشانہ بنایا۔ مگر اِن فتاویٰ کے باوجود اِس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک پاک باطن اور روشن دل بزرگ تھے۔[15]

پریم چند کے ناول میدانِ عمل پر ٹالسٹائی کے ناول Resurrection کے علاوہ دودیگر ناول نگاروں کے ناولوں کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ اِن میں میکسم گورکی (1868-1936)کا ناول The Mother(1906)اور ایچ.جی.ویلز (1866-1946)کا ناول The New Machiavelli(1910) شامل ہیں۔ ٹالسٹائی کے ناول کی طرح، گورکی کا ناول بھی معاشرے اور فرد کے آپسی رشتے کی نوعیت کو موضوع بناتا ہے، جب کہ ویلز کے ناول میں مرکزی کردار ریمنگٹن ملک داری کی دیرینہ خواہش کے تحت بظاہر ایک کامیاب سیاسی کیریئر کے تعاقب میں منزل کی جانب سرعت سے گامزن ہوتا ہے، جب ایک معاشقے کے باعث اُس کی شہرت کا دھڑن تختہ ہو جاتا ہے۔ اِس ناول کا موضوع بھی فرد اور سماج کا باہمی رشتہ ہے۔ میدانِ عمل میں پریم چند نے بھی اِسی رشتے کو موضوع بناتے ہوئے اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے کی گئی

جدوجہد کو، امرکانت اور سکھدا کی کہانی کی صورت میں، فن کارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میدانِ عمل کو پریم چند کے کامیاب ترین ناولوں میں سے ایک گردانا گیا ہے۔ اِس ناول پر گورکی اور ٹالسٹائی کے اثرات کے تناظر میں پریم چند کے فن کے متعلّق علی عبّاس حسینی لکھتے ہیں:

> جن لوگوں نے ٹالسٹائی کی مشہور تصنیف ریسر کشن پڑھی ہے یا گورکی کی مدر دیکھی ہے، وہ بہت آسانی سے پریم چند کے اِس ناول کے نقوشِ اوّل تلاش کر لیں گے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پریم چند میں گورکی کی حقیقت نگاری کم ہے اور ٹالسٹائی کی مثالیت و تصوریّت (Idealism) زیادہ۔(16)

پریم چند نے مذکورہ بالا مغربی ادب کے سربرآوردہ ناول نگاروں کے افکار کو اِس مہارت سے اپنے نالوں میں رچایا بسایا ہے، کہ اِن افکار کو اُردو ادب کا جزو بنا دِیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ناولوں میں اصنافی جمالیات ک ا پورا پورا پاس کرنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی نہیں کہ اُن کی ناول نگاری اسقام سے یکسر پاک ہے، تاہم اُردو ناول کے تشکیلی دور میں ایسی فروگذاشتیں ہرگز قابلِ مواخذہ نہیں ہونی چاہئیں۔ پریم چند کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی وسیع المطالعگی کو تخلیقی منطقوں میں ڈھالنے کا کارہائے نمایاں سرانجام دِیا ہے، اِس تناظر میں علی عبّاس حسینی لکھتے ہیں:

> اُنھوں نے فارسی، اُردو، ہندی اور انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور اِن سب کے جوہر نکال کر اپنی تصنیفات پر موقع موقع سے لگا دِیے ہیں۔ اُنھوں نے اشتراکی ادب بھی پڑھا ہے اور 1921 کے بعد سے اُن کی تصنیفات پر مغربی ادب کا عموماً اور روسی ناولوں کا خصوصاً اثر صاف صاف ظاہر ہے۔ جن لوگوں نے ڈکنس، تھیکرے، ہارڈی، رومن رولاں، ٹرگنو، چیخوف، ٹالسٹائی، گورکی، شارلوخوف اور پرل بک کی مشہور تصنیفات دیکھی ہیں۔ وہ آسانی سے بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان کی اِس شمعِ فروزاں نے کن کن چراغوں سے روشنی حاصل کی ہے۔ لیکن یہ کسبِ ضیا اِس شاطر انداز سے کی گئی ہے کہ ہمارے ناول کا پورا ایوان جگمگا اُٹھا ہے اور نظر رشک خیرگی ہی نہیں محسوس کرتی بل کہ از سر تا پا چلی جاتی ہے۔(17)

ناول اصنافی تناظر کے حوالے سے خالصتاً ایک مغربی النّسل صنف ہے۔ اُردو میں اِس کے حادثاتی طور پر رائج ہونے پر بحث ہو چکی ہے، اِس فصل میں اُردو ناول پر مغربی افکار کے اوّلین نقوش کو نشان زد کیا گیا ہے۔ اِس ابتدائی دور میں اُردو ناول نے حیرت افزا ترقّی کی ہے اور مستقبل میں اِس صنف کے فروغ کے لیے کثیر امکانات روشن کر دِیے ہیں۔ اِن برسوں میں اُردو ناول کے اپنی مبادیات کے متعلّق شعور نے زور پکڑا اور اِس صنف کی افادیت اور دیرپا تاثیر ات نے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں سامنے آنے والی نسل کو اپنی جانب متوجّہ کیا۔ اِس سارے عرصے میں برِصغیرِ پاک و ہند محکوم رہا، تاہم دن بہ دن عوام باشعور بنتے جا رہے تھے۔ البتہ مقدّر کی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جنھوں نے ہندوستانیوں کو محکوم بنایا تھا، اُنھیں کے افکار غلاموں کے اذہان میں آزادیِ اظہارِ رائے کو پروان چڑھانے اور جمہوری طرزِ فکر کو بیدار کرنے میں مہمیز تھے۔ اِس زمانے میں کچھ مشہور مغربی ناولوں کے تراجم بھی شائع ہوئے، تاہم تراجم کا یہ سلسلہ صحیح معنوں میں بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں اپنے جوبن پر آیا، جب سینکڑوں کی تعداد میں مغربی مطبوعات کو اُردو میں ڈھالا گیا، جس میں انفرادی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ادارہ جاتی کاوشیں بھی شامل رہیں۔ طبع زاد اُردو ناول کی بات کی جائے، تو اُردو ناول انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں ہی میں ایک قابلِ قدر صنف کا روپ دھار چکا تھا اور آنے والی صدیوں کے حکمرانی کرنے کی غرض سے اپنی نظریں اُردو کے ادبی افق پر جمائے ہوئے تھا۔ اُردو ناول کے اِس تشکیلی دور میں مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے جہاں اصلاحی طرز کے ناولوں سے اُردو کا دامن مالامال کیا، وہیں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے پاجی ناول نگاری میں نام کمایا، تو عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول کو پروان چڑھایا اور مرزا محمّد ہادی رسوا نے سوانحی ناول کی طرح ڈالنے کے علاوہ کرداری نفسیات پر بھی زور دِیا۔ پریم چند نے اِس تشکیلی دور میں ناول نگاری کے فن کی جانب سنجیدگی کے ساتھ اپنی توجّہ مبذول کی اور اُردو ناول میں طبقاتی کشمکش اور سماجی انقلاب کے لیے اجتماعی جدوجہد ایسے ادق موضوعات کو فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ اپنی کہانیوں میں ڈھالا۔ اِن پانچ ناول نگاروں کی بدولت اُردو ناول نے نہ صرف اصنافی اعتبار سے حیرت انگیز ترقّی کی ہے، بل کہ اِن کی مغربی ادب سے آشنائی کی بدولت صفِ اوّل کے مغربی ادیبوں کی فکشن کے میدان میں سامنے آنے والی کارگزاریاں بھی جزوِ اُردو ناول بنی ممکن ہو سکی ہیں۔ اِن اُردو مشاہیر کی مساعی کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے انیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں ناول نگاروں کی ایک فوجِ ظفر موج ادبی اُفق پر نمودار ہو گئی، تاہم اِن ناول نگاروں کے یہاں مذکورہ بالا مشاہیر کی پیروی کا رجحان بہت غالب ہے اور اِس دور کے بیش تر ناولوں میں تقلیدی رنگ سر چڑھ کر بولتا ہے۔برِّصغیرِ پاک و ہند کے اجتماعی ذہن پر 1857 کے بعد سے مغربی افکار کے انجذاب و قبول کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے، جس کے اثرات دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح، اُردو ادب پر بھی اپنے نقوش ثبت کرتے ہیں۔ یہ اثرات نہ صرف طرزِ احساس کی سطح پر جلوہ افروز ہوئے،

بل کہ اصناف اور اُن کے ذیلی معیارات میں تبدیلیاں لانے کی صورت میں بھی رونما ہوئے، جن کی ایک درخشاں مثال اُردو ناول کی صورت میں موجود ہے۔

حواشی وحوالہ جات

1. عظیم اللہ، ڈاکٹر محمد، اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، لاہور: دارالشعور، 2015، ص:80۔
2. Thomas Day, The History of Sandford and Merton، Philadelphia: J.B. Lippincott & Co., 1869، p. 5۔ نیز دیکھیے: نذیر احمد، بنات النعش، دہلی: کتابی دنیا، 2003، ص:5۔

"Tommy Merton, who, at the time he came fromJamaica, was only six years old, was naturally a very good tempered boy, but unfortunately had been spoiled by too much indulgence. While he lived in Jamaica, he had several black servants to wait upon him, who were forbidden upon any account to contradict him."

دوسری طرف، نذیر احمد بنات النعش کے پہلے ورق پر حسن آرا کا تعرف اِس انداز سے کراتے ہیں:

"حسن آرا کے مزاج کی افتاد ایسی بری پڑتی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا۔ نہ ماں کا ادب نہ آپا کا لحاظ۔ نہ باپ کا ڈر نہ بھائیوں سے ملاپ۔ نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں۔ لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں۔ غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اُٹھائے رہتی ہے۔"

(بنات النعش) دہلی: کتابی دنیا،(2003 ، ص5 :

دونوں ناولوں میں فرق صرف یہ ہے کہ تھامس ڈے کے ناول میں تمام اہم کردار مرد ہیں، جب کہ نذیر احمد کے ناول میں سبھی اہم کردار خواتین ادا کرتی ہیں۔ رچرڈسن کے ناول Pamela کی مراۃ العروس سے پائی جانے والے مشابہت کی طرح، تھامس ڈے کا ناول The History of Sandford and Merton بھی بنات النعش سے اِس قدر مشابہت رکھتا ہے کہ نذیر احمد کی دونوں ناولوں سے عدم واقفیت کا بالفعل کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

3. John Bunyan, The Pilgrim's Progress ،Minneapolis: Desiring God ،2014 ،p. نیز دیکھیے: نذیر احمد، مجموعۂ ڈپٹی نذیر احمد، دہلی: فرید بک ڈپو، 2005، ص:293۔

بنیان کی تمثیل میں کرسچین پر گزرنے والی وارداتِ روحانی ملاحظہ کیجیے:

"As I walked through the wilderness of this world, I lighted on a certain place, where was a den; and I laid me down in that place to sleep: and as I slept, I dreamed a dream. I dreamed, and, behold, "I saw a man clothed with rags, standing in a certain place, with his face from his own house, a book in his hand, and a great burden upon his back". I looked, and saw him open the book, and read therein; and as he read, he wept and trembled; and not being able to contain, he brake out with a lamentable cry, saying, What shall I do?"

جہاں کرسچین کی خواب میں عیسائی راہب سے ملاقات ہوتی ہے اور راہب اپنی کشف و کرامات کی بدولت کرسچین کو صراطِ مستقیم دِکھاتا ہے، وہیں نذیر احمد کے زیرِ بحث ناول کا مرکزی کردار نصوح خواب میں اپنے مرحوم والد کو قابلِ مواخذہ صورتِ حال سے دوچار دیکھ کر، سراسیمہ ہو جاتا ہے اور اپنے گناہوں کے ازالے کی ٹھان لیتا ہے:

"یہ لوگ تو شادی اور رت جگے کے ارادے کر رہے تھے اور نصوح اپنے خواب کے تصوّر میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اُس کا دل مان گیا کہ یہ خواب میرے وہم و خیال کا بنایا ہُوا تو ہرگز نہیں ہے۔ ہو نہ ہو یہ امر من اللہ ہے۔ خواب کیا ہے، رویائے صادقہ اور الہامِ الٰہی ہے۔ باپ کا اظہار اُس نے ایسی توجّہ سے سنا کہ حرف بحرف نوکِ زبان یاد تھا۔ جتنے الزام باپ پر لگائے تھے، غور کرتا تھا تو سب اپنے میں پاتا تھا۔"

(مجموعۂ ڈپٹی نذیر احمد) دہلی: فرید بک ڈپو،(2005 ، ص293 :

کرسچین کی طرح، نصوح کا خواب بھی اُس کی زندگی کے دھارے کو ایک نئی سمت کی جانب موڑنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ دونوں کہانیوں میں اِس حد تک مشابہت کا پایا جانا قطعاً محض اتّفاق یا حادثاتی امر نہیں ہو سکتا۔

4. عظیم اللہ، ڈاکٹر محمد، اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، لاہور: دارالشعور، 2015، ص:106۔
5. نثار، ڈاکٹر زاہرہ، ادبی تحریکوں کے اردو ناول پر اثرات، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، 2018، ص:90۔
6. عظیم اللہ، ڈاکٹر محمد، اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، لاہور: دارالشعور، 2015، ص:108۔
7. خان، معین احمد، "اردو کے اہم ناولوں پر انگریزی ناول کے اثرات"، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بریلی یونیورسٹی، 2009، ص:27۔
8. نثار، ڈاکٹر زاہرہ، ادبی تحریکوں کے اردو ناول پر اثرات، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، 2018، ص:91–92۔
9. خان، معین احمد، "اردو کے اہم ناولوں پر انگریزی ناول کے اثرات"، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بریلی یونیورسٹی، 2009، ص:22۔
10. خاں، ڈاکٹر وحید، مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار، نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 1995، ص:74۔

11. سرمست، یوسف، پریم چند کی ناول نگاری، حیدرآباد: الیاس ٹریڈرز پبلشر اینڈ بک سیلر، 1986، ص:246–247۔
12. حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، ص:297۔
13. رئیس، ڈاکٹر قمر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2004، ص:122۔
14. حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، ص:296۔
15. پریم چند، منشی، کلیاتِ پریم چند (جلد 21)، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، 2003، ص:86۔
16. حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، ص:300۔
17. ایضاً، ص:308–309۔

References:

1. Azimullah, Dr. Muhammad. *Asarāt-e-Ingleesi Novel bar Urdu Novel (The Impact of English Novel on Urdu Novel)*. Lahore: Dar al-Shaur, 2015, p. 80.
2. Day, Thomas. *The History of Sandford and Merton*. Philadelphia: J.B. Lippincott & Co., 1869, p. 1.
   See also: Nazir Ahmad. *Banat-un-Nash*. Delhi: Kitabi Dunya, 2003, p. 5.
3. Bunyan, John. *The Pilgrim's Progress*. Minneapolis: Desiring God, 2014, p. 1. See also: Nazir Ahmad. *Majmua Deputy Nazir Ahmad*. Delhi: Fareed Book Depot, 2005, p. 293.
4. Azimullah, Dr. Muhammad. *Asarāt-e-Ingleesi Novel bar Urdu Novel*. Lahore: Dar al-Shaur, 2015, p. 106.
5. Nisar, Dr. Zahra. *Adabi Tehrikon ke Urdu Novel par Asrat (The Influence of Literary Movements on Urdu Novel)*. Lahore: Maghribi Pakistan Urdu Academy, 2018, p. 90.
6. Azimullah, Dr. Muhammad. *Asarāt-e-Ingleesi Novel bar Urdu Novel*. Lahore: Dar al-Shaur, 2015, p. 108.
7. Khan, Moin Ahmad. "Asarat-e-Ingleesi Novel bar Ahem Urdu Novels (Impact of English Novels on Major Urdu Novels)." PhD Thesis, Bareilly University, 2009, p. 27.
8. Nisar, Dr. Zahra. *Adabi Tehrikon ke Urdu Novel par Asrat*. Lahore: Maghribi Pakistan Urdu Academy, 2018, pp. 91–92.
9. Khan, Moin Ahmad. "Asarat-e-Ingleesi Novel bar Ahem Urdu Novels." PhD Thesis, Bareilly University, 2009, p. 22.

10. Khan, Dr. Waheed. *Mirza Ruswa ke Novels ke Niswani Kirdar (The Female Characters in the Novels of Mirza Ruswa)*. New Delhi: Takhleeqkar Publishers, 1995, p. 74.

11. Sarmast, Yusuf. *Premchand ki Novel Nigari (The Novel Craft of Premchand)*. Hyderabad: Ilyas Traders Publishers & Book Sellers, 1986, pp. 246–247.

12. Hussaini, Ali Abbas. *Novel ki Tareekh aur Tanqeed (History and Criticism of the Novel)*. Aligarh: Educational Publishing House, 2005, p. 297.

13. Raees, Dr. Qamar. *Premchand ka Tanqeedi Mutala'a ba Hesiyat-e-Novel Nigar (A Critical Study of Premchand as a Novelist)*. Delhi: Educational Publishing House, 2004, p. 122.

14. Hussaini, Ali Abbas. *Novel ki Tareekh aur Tanqeed*. Aligarh: Educational Publishing House, 2005, p. 296.

15. Premchand, Munshi. *Kulliyat-e-Premchand*, Vol. 21. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2003, p. 86.

16. Hussaini, Ali Abbas. *Novel ki Tareekh aur Tanqeed*. Aligarh: Educational Publishing House, 2005, p. 300.

17. Ibid., p. 308–309.

Bibliography

Ahmad, Dr. Muhammad Azimullah. *Asarāt-e-Ingleesi Novel bar Urdu Novel (The Impact of English Novel on Urdu Novel)*. Lahore: Dar al-Shaur, 2015.

Ahmad, Nazir. *Banat-un-Nash*. Delhi: Kitabi Dunya, 2003.

Ahmad, Nazir. *Majmua Deputy Nazir Ahmad*. Delhi: Fareed Book Depot, 2005.

Bunyan, John. *The Pilgrim's Progress*. Minneapolis: Desiring God, 2014.

Day, Thomas. *The History of Sandford and Merton*. Philadelphia: J.B. Lippincott & Co., 1869.

Hussaini, Ali Abbas. *Novel ki Tareekh aur Tanqeed (History and Criticism of the Novel)*. Aligarh: Educational Publishing House, 2005.

Hussaini, Ali Abbas. *Kulliyat-e-Premchand (Vol. 21)*. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2003.

Khan, Dr. Moin Ahmad. "Urdu ke Ahem Novelon par Ingleesi Novel ke Asarat." PhD diss., Bareilly University, 2009.

Khan, Dr. Waheed. *Mirza Ruswa ke Novelon ke Niswani Kirdar*. New Delhi: Takhleeqkar Publishers, 1995.

Nisar, Dr. Zahra. *Adabi Tehrikon ke Urdu Novel par Asrat*. Lahore: Maghribi Pakistan Urdu Academy, 2018.

Rais, Dr. Qamar. *Premchand ka Tanqeedi Mutala: Ba Haisiyat-e-Novel Nigar*. Delhi: Educational Publishing House, 2004.

Sarmast, Yusuf. *Premchand ki Novel Nigari*. Hyderabad: Ilyas Traders Publisher and Book Seller, 1986.